جناب محمد مظہر الدین صدیقی

اسلام کے معاشی احکام اور عہدِ جدید کے تقاضے

خلفائے راشدین اور بنو اُمیہ کے عہدِ حکومت میں تبدیل شدہ حالات کے باعث پیشِ نظر مسائل حل کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی احکام میں حسب ضرورت ترمیم اضافہ کیا گیا اکثر صورتوں میں جہاں خلفائے راشدین نے ترمیم و اضافہ کیا وہاں یہ ترمیمات اور اضافے دین کے اُصول و کلیات پر مبنی تھے۔ لیکن اس واقعہ سے بہر حال انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ حضور رسالتمآبؐ کے احکام میں اضافہ اور ترمیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربوں کی فتوحات کے بعد انہیں جن معاشی مسائل سے سابقہ پڑا ان کی نوعیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مسائل سے مختلف تھی۔ عہدِ رسالت میں اسلامی حکومت کے حدود عرب سے آگے نہیں بڑھے تھے اور اسلام کو زرعی معیشت کے مسائل سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ کیونکہ عرب میں زراعت کا رقبہ بہت محدود تھا اور لوگ تجارت یا گلہ بانی کے ذریعہ معاش حاصل کرتے تھے۔ اس کے علاوہ عرب میں بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیریں وجود میں نہیں آئی تھیں۔ اس کے برخلاف جب اسلام روم اور ایران پر فتح یاب ہُوا تو مسلمانوں کو ایک ترقی یافتہ زرعی معیشت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ایران۔ عراق۔ شام اور مصر میں بڑے بڑے قطعاتِ اراضی اور جاگیریں چند افراد کے ہاتھوں میں تھیں اور کاشتکاروں کے حقوق نہایت بے دردی سے پامال کئے جاتے تھے اس لئے اسلامی حکمرانوں کو لازماً ان طریقوں میں ترمیم و اضافہ کرنا پڑا جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں کام لیا تھا۔ ان میں سے بنو اُمیہؓ نے جو ترمیمات اور اضافے کئے وہ کسی مذہبی یا اخلاقی اصول پر مبنی نہ تھے بلکہ اس میں عربی قومیت اور طبقاتی امتیازات کا پیدا کردہ جذبۂ تفوق کام کر رہا تھا۔ اس کے برخلاف خلفائے راشدین اور بالخصوص حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں میں جو اضافے یا ترمیمات کیں ان میں سے کوئی بھی دین کے بنیادی اُصولوں کے منافی نہ تھا۔ مثلاً حضرت عمرؓ کا یہ اجتہاد و اضافہ کہ اُنہوں نے مفتوحہ علاقوں کی اراضی کو اہلِ فوج میں تقسیم نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کو اپنی سلطنت میں زمین کی خریداری اور حصول جائداد سے روک دیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ کار سے بالکل مختلف تھا۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے خود مسلمانوں کو زمینیں اور اقطاع عنایت فرمائے تھے لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل جو بظاہر خلافِ سنّت معلوم ہوتا ہے، اُصولِ اسلام کی رُو سے نہ صرف جائز بلکہ ضروری تھا۔ آنحضرتؐ کو اپنے حینِ حیات اس خطرہ کا سامنا تھا کہ مسلمان مجاہدانہ زندگی اور تبلیغِ اسلام کا فریضہ ترک کر کے

بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار بن بیٹھیں گے۔ آپ نے مسلمانوں کو جو زمینیں عطا فرمائی تھیں ان کا رقبہ اس قدر محدود تھا کہ مسلمان خود توان اراضی پر کاشت کر سکتے تھے مگر زمینداروں اور جاگیرداروں کی طرح آرام و فرصت کے ساتھ غریب کاشتکاروں کی کمائی سے استفادہ کرنا ان کے لئے ناممکن تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جو مسئلہ پیش تھا وہ اس سے بہت مختلف تھا۔ عراق اور شام کی مفتوحہ اراضی کو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کے مطابق اہلِ فوج میں تقسیم کر دیا جاتا تو مسلمانوں میں نظامِ زمینداری اور جاگیرداری کی تمام خرابیاں پیدا ہو جاتیں اور یہ لوگ تبلیغ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کے فریضہ سے غافل ہو کر امیرانہ راحت طلبی میں پڑ جاتے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو تبدیل کرنے میں کوئی مذہبی رکاوٹ نہیں محسوس کی۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ مسئلہ یونہی پیش آتا تو آپ بھی حضرت عمرؓ کی مانند تقسیم اراضی کے مطالبہ کو نامنظور کر دیتے اور مسلمانوں کو زمینات خریدنے سے منع فرما دیتے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ دینے سے انکار کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل میں تبدیلی فرمائی مگر یہ اجتہاد بھی جو تقاضائے وقت کے مدِّ نظر کیا گیا تھا اُصولِ اسلام کے منافی نہ تھا۔ اگر پیروی سنّت اور اتباعِ شریعت کے معنے وہ ہوتے جو آج کل سمجھے جاتے ہیں تو حضرت عمرؓ جیسی ہستی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقِ کار میں تبدیلی کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اور نہ دیگر صحابہ اس امر کے روادار ہوتے کہ جس بات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے جائز اور ضروری ثابت کر دیا تھا اسے محض تبدیلیٔ حالات کی وجہ سے ترک کر دیا جائے۔ پھر یہی نہیں بلکہ حضرت عمرؓ نے صدقات و زکوٰۃ کی آمدنی میں سے اہلِ کتاب کے معذور اور ضعیف افراد کو گزارہ دینے کا جو فیصلہ کیا اس کی بھی کوئی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل میں نہیں ملتی ہے۔ اگر خلفائے راشدین سنّت نبویؐ کی سند کے بغیر کوئی فیصلہ نہ کرتے ہوتے تو ان سے اس قسم کے اجتہادات ہرگز سرزد نہ ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام کسی معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت صرف اسناد کو مدِّ نظر نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ نئے حالات اور ضروریات کا بھی خیال کرتے تھے۔ البتہ وہ یہ احتیاط ضرور کرتے تھے کہ ان کا فیصلہ دین کے اصول و کلیات پر مبنی ہو اور روحِ اسلام کے منافی نہ ہو۔ جہاں ان کی کسی ترمیم و تجدید سے اُصول اسلام کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ ہوتا وہ ایسے اقدام سے گریز کرتے۔

اب آج کل کے جدید حالات اور تقاضوں میں ہم کو بھی یہی اُصول اور طریق کار اختیار کرنا چاہئے ورنہ اگر ہم ہر معاشی، سیاسی اور تمدّنی مسئلہ میں نظائر اور اسناد کی تلاش کرتے پھریں تو ہماری یہ کوشش یقیناً ناکام ہوگی کیونکہ ہمارے مسائل کی نوعیت ان مسائل سے بالکل جُدا ہے جو عہدِ اسلامی میں مسلمانوں کو پیش آتے تھے۔

اس نوبت پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام سے کیا مراد ہے۔ آیا اس اصطلاح کا اطلاق ان جزوی اور فروعی احکام پر ہوتا ہے جو قرآن اور حدیث میں پائے جاتے ہیں یا اس سے مراد وہ اساسی

اُصول ہیں جن پر یہ تفصیلی احکام و قوانین مبنی ہیں اور جن کا ذکر بھی اکثر صورتوں میں قرآن میں پایا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہمارے سامنے بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر اسلام عہدِ جدید میں پیدا ہوتا اور اسے موجودہ معاشی مسائل سے سابقہ پڑتا تو وہ بعینہٖ وہی احکام دیتا اور وہی قوانین نافذ کرتا جو عہدِ رسالت اور خلافت راشدہ میں جاری کئے گئے تھے یا مقتضیاتِ وقت کے لحاظ سے ان میں ترمیم اور تبدیلی کرتا۔ مثلاً غلامی کے مسئلہ کو لیجئے۔ اسلام نے اپنے زمانہ میں غلامی کو جائز قرار دیا تھا مگر اس کے ساتھ ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اسلام کو یہ رسم سخت ناپسند تھی۔ چنانچہ اس نے اس رواج کو کم کرنے اور مٹانے کے لئے جو قواعد وضع کئے تھے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر حالات پر اس کا بس چلتا تو وہ اسے بالکل نیست و نابود کر دیتا۔ لیکن جس عہد میں اسلام ظہور پذیر ہوا تھا اس میں غلامی کا رواج اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا اور ساری دُنیا کا معاشی نظام اس رواج کے دامن سے ایسا مضبوط بندھا ہوا تھا کہ اگر عہدِ رسالت میں اسلامی حکومت مشرق و مغرب کے تمام ملکوں تک پھیلی ہوئی ہوتی تب بھی وہ یک لخت اور بیک جنبشِ قلم اس کو مسدود کرنے سے عاجز رہتا۔ لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے زمانے میں یہ صورتِ حال بھی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ ابتدائے خلافت راشدہ تک اسلامی حکومت صرف عرب تک محدود تھی، اور غلامی کا رواج ایران۔ یونان۔ روم۔ شام اور مصر غرض کہ مہذب دُنیا کے ہر گوشہ میں موجود تھا۔ اس لئے اسلام نے صرف اس کے شدائد اور مظالم کی تخفیف پر توجہ کی اور جزوی اصلاحات سے آگے نہ بڑھ سکا۔ تو کیا اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر اسلام کو موجودہ حالات ملتے اور اس رسم کو مٹا دینے سے کسی عالمگیر بدنظمی یا معاشی اختلال کا امکان نہ ہوتا تب بھی غلامی کے متعلق وہ وہی احکام دیتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے زمانہ میں دینے پڑے تھے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو زمینداری اور جاگیرداری کے بارے میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اسلام نے ایک خاص عہد کے حالات و مقتضیات کے مدِنظر اس نظام کو روا رکھا تھا اس لئے اس کی یہ اجازت آج بھی جُوں کی تُوں قائم رہنی چاہئے اور اس میں کسی تبدیلی، ترمیم یا اضافہ کا خیال کرنا کفر۔ الحاد اور بے دینی ہے۔ حالانکہ خود حضرت عمرؓ نے حتی المقدور مسلمانوں کو ان دونوں بلاؤں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی یہاں تک کہ مسلمانوں کو حصول اراضی سے بھی روک دیا۔

درحقیقت اس مسئلہ میں دو انتہا پسند گروہ عدل و توازن کے نقطہ سے ہٹ کر اسلامی احکام کی صحیح تعبیر کا دروازہ بند کر رہے ہیں۔ ایک گروہ اشتراکیت زدہ مسلمانوں کا ہے جس کا خیال یہ ہے کہ اگر اسلام اس زمانہ میں ظہور پذیر ہوتا تو وہ وہی کچھ کرتا جو رُوس اور چین نے کیا ہے۔ دوسرے گروہ کی نمایندگی وہ لوگ کرتے ہیں جن کا خیال ہے کہ اگر اسلام کو موجودہ زمانہ ملتا تب بھی اس کے طریق کار اور جزوی احکام میں کوئی تغیر نہ ہوتا، بلکہ وہ من وعن وہی کرتا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں کیا تھا۔ بالفاظِ دیگر یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ

دَور کے تبدیل شدہ حالات میں بھی اسلام کے انھیں احکام اور قوانین پر عمل ہونا چاہیئے جو عہد رسالت اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں نافذ کئے گئے تھے۔ اور ان میں ترمیم واضافہ کی کوشش کفر۔ دہریّت اور اشتراکیت کے مترادف ہے۔ یہ دونوں نقاطِ نظر غلط ہیں۔

اسلام چند بُنیادی اُصولوں اور کلیات کا نام ہے نہ کہ جزوی اور فروعی احکام کا۔ اس لئے اگر اسے زمانۂ جدید کے حالات ملتے تو وہ ان بنیادی اُصولوں سے عہدِ جدید کے تقاضوں کے مطابق نئے جزوی احکام و قوانین مرتب کرتا۔ وہ اشتراکیت کے پیش کردہ حل کو یقیناً رد کر دیتا کیونکہ یہ حل اشتراکیت کے تصوّرِ حیات اور اس کے بنیادی اُصولوں سے مستنبط کیا گیا ہے۔ لیکن وہ ابتدائے اسلام کے جزوی اور فروعی قوانین کو بھی نہ اختیار کرتا کیونکہ یہ قوانین اگرچہ اسلامی اصولوں سے ماخوذ تھے۔ لیکن ان کے استخراج و استنباط میں اس زمانہ کے مخصوص حالات کا بھی بڑا دخل تھا جو آج ناپید ہو چکے ہیں۔ زمینداری، جاگیرداری اور دیگر معاشی مسائل حل کرنے کے لئے ہمیں اسناد اور نظائر کی صرف اس حد تک ضرورت ہے جہاں تک ان سے اسلام کے بنیادی اصولوں پر روشنی پڑتی ہے۔ لیکن ان اسناد اور نظائر میں اب کوئی اہمیّت نہیں رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلام کے وہ بُنیادی اُصول اور کلیات کیا ہیں جن کی مدد سے ہم اس زمانہ کے معاشی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اُصولوں کو اخذ کرنے کے لئے ہمیں قرآن۔ سنّت اور خلفائے راشدین کے طرزِ عمل پر غور کرنا اور یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ ان میں کون سی باتیں وقتی حالات و مصالح کے اقتضا سے عمل میں آئی تھیں اور کون سے امور اصولی حیثیت رکھتے ہیں جن کا اطلاق اس زمانہ کے حالات پر بھی ہو سکتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے قرآن و حدیث پر غور کیا جائے تو حسب ذیل اُصول مستنبط ہوتے ہیں:

اوّلاً اسلام نے اپنے زمانہ میں جن امور کی صرف اجازت دی تھی لیکن جن کے متعلق اس نے کوئی سلبی یا ایجابی حکم نہیں دیا ان کے بارے میں ملّتِ اسلامی بلحاظ حالات نئے فیصلے کرنے کی مجاز ہے۔

دوئم اسلام نے مال اور زمین کی انفرادی ملکیّت کا حق قائم رکھا تھا اور جہاں تک اس کا منشاء سمجھ میں آسکتا ہے وہ آیندہ بھی اس حق کو قائم رکھنا چاہتا تھا لیکن وہ انفرادی ملکیت کا لامحدود حق نہیں دیتا ہے بلکہ اس کا مطالبہ ہے کہ ہر قسم کی دولت (جس میں عطیاتِ فطرت بھی شامل ہیں) جو افراد کی واجبی ضروریات سے زیادہ ہو معاشرتی سُود و بہبود کے کاموں پر صرف کی جانی چاہیئے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم کا ارشاد ہے:

لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔	تم نیکی نہیں حاصل کرتے ہو جب تک اس چیز کو خدا کی راہ میں نہ صرف کرو جو تم کو محبوب ہے۔
والذین یکنزون الذھب والفضۃ	جو لوگ سونا چاندی (یعنی مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور

ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ — اسے خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کے لئے سخت عذاب کی خبر سنا دو۔

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ ن الذی جمع مالاً وعددہ یحسب ان مالہ اخلدہ۔ — خرابی ہے ہر طعنہ دینے والے عیب چننے والے کے لئے جو مال جمع کرتا ہے اور اسے گنتا ہے، یہ شخص سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ باقی رہے گا۔

ان آیات سے صاف اور صریح طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جو شخص زائد مال دولت کو جس میں اسکی ذہنی اور علمی قابلیتیں بھی شامل ہیں مفید سماجی کاموں میں نہیں لگاتا ہے اس کے انفرادی حقِ ملکیت کا محض اس لئے لحاظ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ دوسرے مذہبی فرائض مثلاً نماز اور زکوٰۃ پابندی سے ادا کرتا ہے بلکہ اسٹیٹ اسے اس امر پر مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اپنا مال یا اپنی قابلیتیں دوسرے انسانوں کی بھلائی کے کاموں میں لگائے۔ اس جبر کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اسٹیٹ اس سے محصول لے سکتی ہے یا اسے جبری خدمات پر مامور کر سکتی ہے یا اس کے حقِ ملکیت کو محدود کر سکتی ہے۔ بالکل یہی صورت زمین کی ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس جو زائد از ضرورت زمین ہو جسے وہ بیکار ڈال رکھے یا ایسے طریقوں سے اس کا استعمال کرے کہ اس کی پیداوار گھٹ جائے تو حکومت اس سے یہ زائد زمین بجبر حاصل کر کے دوسرے افراد میں تقسیم کر سکتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے:

قال کان لرجال من فضول ارضین علیٰ عھد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کان لہ ارض فلیزرعھا او لیمنحھا اخاہ فان ابیٰ فلیمسک۔ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں لوگوں کے پاس زائد از ضرورت زمینیں تھیں عموماً لوگ نصف، تہائی یا چوتھائی پر اپنی زمینوں کا بندوبست کیا کرتے تھے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا جس کے پاس زمین ہو وہ اس میں خود کاشت کرے ورنہ پھر اپنے کسی بھائی کو دیدے، اور اگر وہ انکار کرتا ہے تو رُک جائے۔

اس حدیث سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ منشاء ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اسی زمین اپنی ملکیت میں لیں جتنی پر وہ کاشت کر سکیں یا اپنے افراد خاندان کے ذریعہ کاشت کروا سکیں۔ اس لئے زیادہ زمین کی ملکیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناپسند تھی جیسا کہ یہ حدیث ظاہر کرتی ہے۔ آپ نے اپنے زمانہ میں زائد اراضی کی منصفانہ تقسیم کے لئے اگر قانون اور حکومت کا وسیلہ استعمال نہیں کیا تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ اس زمانہ تک یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں ہوا تھا اور محدودے چند افراد کو چھوڑ کر بہت کم لوگوں کے پاس زائد از ضرورت زمین تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہوگا کہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہدِ مبارک میں اس مسئلہ کے متعلق کوئی قانون نہیں بنایا۔ لہٰذا اب تا قیامت اس کے بارے میں کوئی نیا حکم نہیں دیا جا سکتا۔

سوم۔ اسلام پیدائش دولت کے عوامل میں محنت اور سرمایہ کو مساوی اہمیت دیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے برخلاف جس کا نظریہ یہ ہے کہ پیدائش دولت میں اضافہ کرنے کے لئے صرف سرمایہ کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اسلام کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں اور کارکنوں کی بھی اتنی ہی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے جتنی سرمایہ کی۔ یعنی مزدوروں کو معقول اُجرت دی جانی چاہیئے جس سے ان کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ اسی کے ساتھ انھیں اتنی فرصت بھی ملنی چاہیئے کہ وہ تفریحی مشاغل میں حصّہ لے سکیں۔ نیز ناکارگی کی صورت میں جو کسی اتفاقی حادثہ کی وجہ سے واقع ہو انھیں اسٹیٹ کی طرف سے گزارہ ملنا چاہئے۔ یہ اُصول ہم اس مشہور حدیث سے اخذ کرتے ہیں جس میں غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

اخوانکم خولکم جعلھم اللہ تحت ایدیکم فمن کان اخوہ تحت یدہ فلیطعمہ مما یاکل والیلبسہ مما یلبس ولا تکلفھم ما یغلبھم فان کلفتموھم فاعینوھم۔

تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں جو تمہارے ہاتھ کے نیچے ہیں پس جس کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے ہو تو اس پر واجب ہے کہ اسے وہی کھلائے اور پہنائے جو وہ خود کھاتا اور پہنتا ہے، اور ان سے کوئی ایسا کام نہ لے جو ان کی طاقت سے باہر ہو، پھر اگر ان سے ایسا کام لیا جائے تو ان کی مدد کرنی بھی ضروری ہے۔

یہ حدیث غلاموں کے متعلق ہے لیکن اس کا اطلاق آج کل کے مزدور پیشہ اور محنت پیشہ افراد پر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس زمانہ میں مزدور طبقہ کی بالکل وہی حیثیت ہے جو اسلام کے عہد میں غلاموں کی تھی۔ یہ لوگ تقریباً اتنے ہی بے بس ہیں جتنے قدیم زمانہ میں غلام ہوتے تھے اور ان کی محنت سے سرمایہ دار اور مالدار طبقات اتنا ہی استفادہ کرتے ہیں جتنا غلاموں سے ان کے آقا کیا کرتے تھے۔ اس لئے جب غلاموں کے متعلق حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تاکید ہے کہ انھیں وہی کھلاؤ اور پہناؤ جو خود کھاتے اور پہنتے ہو۔ ان سے اتنا زدہ کام نہ لو کہ وہ بالکل تھک کر چور ہو جائیں تو یہ حکم مزدور طبقہ کے افراد پر بھی اسی طرح منطبق ہوتا ہے۔

چہارم۔ اسلام اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ معاشرہ کے غریب۔ معذور۔ ضعیف۔ بیمار اور قرضدار اشخاص کو یا یتیموں اور بیواؤں کو بالکل بے سہارا چھوڑ دیا جائے اور ان کی پرورش کی ذمہ داری نہ افراد قبول کریں اور نہ اسٹیٹ۔ اس غرض سے اسلام نے اپنے زمانہ میں زکوٰۃ کا حکم دیا تھا جس کی اصل روح یہ تھی کہ معاشرے کے کمزور افراد کو اجتماعی طور سے مالی امداد دی جائے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بلکہ بنو اُمیہ کے دَور تک مسلمانوں کی سوسائٹی کا یہ حال تھا کہ اس میں ہر معذور۔ ضعیف۔ بیمار۔ قرضدار۔ یتیم اور بیوہ کو بیت المال سے گزارہ کی رقم دی جاتی تھی۔ یہی اصول آج بھی مسلمانوں کو اختیار کرنا چاہیئے اور اگر زکوٰۃ کی رقم موجودہ حالات میں ناکافی ثابت ہو تو یا تو اس کی شرح میں اضافہ کرکے مزید رقم حاصل کی جاسکتی ہے یا دوسرے محصولات عائد کئے جاسکتے ہیں۔

پنجم۔ اسلام نے ہر قسم کے سُود کو صاف الفاظ میں منع کر دیا ہے۔ موجودہ نظام سرمایہ داری کے تباہ کُن اثرات پر غور کرنے کے بعد کوئی دیانتدار شخص اس امر سے اختلاف نہیں کرے گا کہ اس نظم نے دنیا کو جن آفات و مصائب میں مبتلا کیا ہے ان کی تہ میں سُود کا اصول کارفرما ہے اور اگر اسلامی احکام کے مطابق سُود کو قطعاً ممنوع قرار دیا جائے تو سرمایہ داروں کے مظالم کا نہایت آسانی سے خاتمہ ہو سکتا ہے۔

ششم۔ ایسی اشیاء اور وسائل دولت جو براہِ راست حکومت کی دفاعی تیاریوں سے تعلق رکھتے ہوں یا افادہ عام کے لئے ضروری ہوں یا جن پر انفرادی ملکیّت کا حق تسلیم کرنے سے معاشرے کے عام افراد تنگی اور تکلیف میں مبتلا ہو جائیں انھیں اجتماعی ملکیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس اُصول کی تائید میں ایک حدیث تو وہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابیض بن حمال نامی ایک صحابی کو یمن میں ایک چشمہ جاریہ عطا فرمایا لیکن جب لوگوں نے شکایت کی کہ اس سے تمام آبادی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو آپ نے اپنی اجازت منسوخ فرمادی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام نے اجتماعی ملکیت کے اُصول کو کہیں ناجائز نہیں قرار دیا ہے۔ اور نہ صاف و صریح الفاظ میں اس کی ممانعت کی۔ اگرچہ جیسا ہم پہلے بتا چکے ہیں اسلام کا یہ منشاء نہیں ہے کہ انفرادی ملکیّت کے دائرہ کو اتنا محدود اور تنگ کر دیا جائے کہ اس سے افراد کی جائز آزادیاں بالکل سلب ہو جائیں۔ اور وہ حکومت کے مقابلہ میں بالکل عاجز اور بے بس ہو کر رہ جائیں۔ اور وہ حکومت کے مقابلہ میں بالکل عاجز اور بے بس ہو کر رہ جائیں۔ لیکن اسلام کے متعلق یہ دعوےٰ کرنا بھی غلط ہے کہ اس میں اجتماعی ملکیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ایک محدود دائرے کے اندر اور مخصوص اغراض و مقاصد کے لئے اسلام اجتماعی ملکیّت کی اجازت دیتا ہے۔ ویسے بھی فقہاء نے اس اصول کو تسلیم کیا ہے کہ اگر کسی شے کی ذاتی ملکیت سے افادہ عامہ میں خلل واقع ہو یا عامۃ الناس تنگی اور تکلیف مبتلا ہو جائیں تو اس پر انفرادی ملکیت کا حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ملك احدها بالاحتجار ملك منعه فضاق على الناس فان اخذ العوض عنه اغلاها فخرج عن المواضع الذى وضعه الله من تعميم ذوى الحوائج من غير كلفة۔

(المغنی)

اگر احاطہ بندی کرکے کوئی اس کا مالک ہو جائے تو لوگوں کو اس سے روکے گا اور عوام ضیق اور تنگی میں مبتلا ہو جائیں گے اور اگر اس کا معاوضہ لے گا تو اسے گراں کر دیگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ حق تعالےٰ نے جس غرض کے لئے اس چیز کو جو مقام عطا کیا تھا وہ چیز اس سے ہٹ جائیگی یعنی عام حاجتمندوں کی ضرورت بغیر کسی کلفت و مشقت کے پوری نہ ہو گی۔

اسی طرح علّامہ ابنِ قدامہ نے نمک۔ گندھک۔ مومیائی اور مٹی کے تیل وغیرہ کے متعلق لکھا ہے کہ ان پر انفرادی ملکیت تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے۔ علامہ کہتے ہیں :۔

لا تملك بالاحياء ولا یجوز اقطاعها من الناس ولا احتجارها دون المسلمين لان فيه ضرر للمسلمين وتضييقا عليهم.

نہ آباد کرنے اور نہ حکومت سے جاگیر ملنے کی صورت میں ان کا کوئی مالک ہوسکتا ہے اور نہ یہ جائز ہے کہ عام مسلمانوں پر اس سے استفادہ کی راہ بند کی جائے کیونکہ اس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور ان پر تنگی ہوگی۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر کسی معاشرہ کی تعمیر میں مندرجہ بالا اسلامی اصولوں کو مدِّنظر رکھا جائے۔ تو اس میں معاشی خرابیوں اور ناانصافیوں کی بہت کم گنجائش رہ جائے گی اور ان اصولوں پر جو نظام تعمیر کیا جائے گا وہ اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے مفسدات سے پاک ہوگا۔ کیونکہ اس میں افراد کی معاشی آزادی بھی قائم رہے گی اور اس کے ساتھ اسٹیٹ کو اتنی طاقت بھی حاصل ہوگی کہ وہ معاشرتی سود و بہبود کی غرض سے انفرادی ملکیّت پر پابندیاں عائد کرسکے۔ البتہ ایسے نظام میں اسٹیٹ اتنی طاقتور بھی نہ ہوگی کہ وہ افراد کی جائز آزادیوں کو سلب کرکے انھیں بالکل غلام بنادے۔

جہاں تک اس اُصول کا تعلق ہے کہ اسلام نے جن باتوں کا صریح حکم نہیں دیا ہے اور نہ صریح ممانعت کی ہے انکے بارے میں ملّت اسلامی نئے فیصلے کرنے کی مجاز ہے۔ ہمارے خیال میں اس سے بہت کم مسلمانوں کو اختلاف ہوگا۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان امور کے بارے میں ملّت کا جو نیا فیصلہ ہوگا وہ اسلام کے بنیادی اُصولوں اور کلیاتِ دین سے اخذ کیا جائے گا اور ان کے منافی نہ ہوگا۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کو جو آزادی اسلام نے عطا کی ہے اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ اپنی خواہشات و اغراض کے مطابق جیسا چاہیں عمل کریں بلکہ اس دائرہ میں بھی ان پر یہ لازم ہے کہ وہ ان حدود سے متجاوز نہ ہوں جو دین کے بنیادی اصول و کلیات سے مستنبط ہوتے ہیں۔ دوسرے اُصول کی بابت بھی بہت کم مسلمانوں کو اختلاف ہوگا یعنی اس امر کے متعلق کہ اسلام نے ذاتی ملکیّت کے حق کو قائم رکھا ہے لیکن یہ حق لامحدود نہیں ہے بلکہ ضروریات وقت اور مصالح ملّت کے لحاظ سے اس پر پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں۔ اب صرف اختلاف اس امر میں باقی رہ جاتا ہے کہ انفرادی ملکیّت پر کس حد تک اور کن طریقوں سے پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں۔ اس مسئلہ میں ایک گروہ کی رائے یہ ہے کہ انفرادی ملکیّت کے حق کو صرف انھیں طریقوں اور اسی حد تک محدود کیا جاسکتا ہے جن کا ثبوت قرآن اور احادیث سے ملتا ہے۔ یعنی مسلمانوں پر زکوٰۃ لگائی جاسکتی ہے اور قانونِ وراثت کا نفاذ کرکے اجتماعی دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں آسکتی ہے لیکن دولت اور ملکیّت کو محدود کرنے کا کوئی ایسا طریقہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جو اسلامی عہد میں مستعمل نہ تھا۔ اگر اس گروہ کے استدلال کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو اس زمانہ میں کوئی اسٹیٹ اسلامی اصولوں پر نہیں چلائی جاسکتی ہے۔ کیونکہ آج کل کے زمانہ میں اسٹیٹ کی ذمہ داریوں اور فرائض کا دائرہ اسلامی عہد کی اسٹیٹ کے دائرہ فرائض سے بہت زیادہ وسیع ہوگیا ہے۔ اسی نسبت سے اس کے وسائل آمدنی بھی زیادہ ہونے چاہئیں۔ یہ وسائل صرف اسی حالت میں بہم پہنچائے جاسکتے ہیں۔ جب افراد کی آمدنیوں پر

بہت زیادہ محصولات عائد کئے جائیں یا انفرادی ملکیت کے حق کو محدود کیا جائے۔ اسلام نے اپنے زمانہ میں لوگوں پر صرف چند محصول لگائے تھے۔ اور ان کے حقِ ملکیّت کو تقریباً آزاد چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ اس زمانہ تک اسٹیٹ کے فرائض کا دائرہ صرف دفاع اور قیامِ امن تک محدود تھا۔ اس لئے آج کے زمانہ میں جبکہ اسٹیٹ کو تعلیم، طبّی امداد اور مواصلات وغیرہ کے متعلق بہت وسیع ذمّہ داریاں اپنے سر لینی پڑتی ہیں کوئی اسٹیٹ صرف انھیں وسائل آمدنی پر اکتفا کرے جو اسلامی عہد میں جائز تصوّر کی جاتی تھیں یا انفرادی ملکیّت کے حق کو صرف اتنا ہی محدود کرے، جتنا اسلام نے اپنے زمانہ میں کیا تھا تو وہ مالی حیثیت سے ایک دن بھی کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔

یہی صورت ملکیّت زمین کی بھی ہے۔ اسلام نے اپنے زمانہ میں زمین کی ملکیّت پر کوئی قید عائد نہیں کی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں قابلِ کاشت زمین کا رقبہ محدود تھا اور کسی شخص کے پاس اتنی زمین نہ تھی جو اس کی ضروریات سے بہت زیادہ ہو۔ پورے عرب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے دو خلفاء کے عہد میں ایک بڑے زمیندار یا جاگیردار کا بھی وجود نہ تھا جس سے یہ اندیشہ ہوتا کہ ملک کی بیشتر زمین چند افراد کے ہاتھوں میں مجتمع ہو جائے گی۔ آج کل کے بڑے بڑے ملکوں میں صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ قابلِ زراعت زمین کا رقبہ نہ تو اتنا محدود ہے کہ کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ زمین ہی نہ ہو اور نہ اتنا وسیع کہ تمام زراعت پیشہ افراد کو ان کی ضرورت کے مطابق زمین مل سکے۔ ایسی صورت میں زمین کی منصفانہ تقسیم کا مسئلہ معاشرہ کی ترقی اور بہبودی کے لئے بے حد اہمیّت رکھتا ہے۔

درحقیقت زمین کا مسئلہ آبادی کے مسئلہ سے متعلق ہے اور اس کا دارومدار اس پر ہے کہ زمین پر آبادی کا دباؤ کتنا پڑ رہا ہے۔ جس وقت امریکہ میں انگریز اور فرانسیسی نو آبادکار داخل ہوئے ان کے سامنے زمین کا رقبہ اتنا محدود تھا کہ جس کے ہاتھ جتنی زمین آئی اس نے لے لی۔ اس طرح غیر محدود انفرادی ملکیّت کے اصول پر عمل کرنے سے نو آبادکاروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لیکن جُوں جُوں آبادی میں اضافہ ہوتا گیا زمین کے مسئلہ نے دوسری نوعیّت اختیار کر لی۔ اب اگر کسی ملک میں آبادی زیادہ اور زمین کا رقبہ محدود ہو تو کیا اس میں چند افراد کو یہ حق دیا جا سکتا ہے کہ وہ زمین کے بیشتر حصّہ کے بلا شرکت غیرے مالک بن بیٹھیں اور انسانوں کی ایک بڑی اکثریت کو مزدوری پیشہ کاشتکاروں کی حیثیت سے استعمال کریں۔ اور کیا ایسے حالات میں اسٹیٹ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ آبادی کی ایک بہت بڑی اکثریت کے ساتھ انصاف کرنے کی غرض سے چند افراد کے حقِ ملکیّت کو محدود کر دے۔ اگر یہ چیز خلافِ اسلام ہے تو پھر کون مسلمان یہ دعوےٰ کر سکتا ہے کہ اس کا مذہب حق و انصاف اور معاشرتی عدل کا علمبردار ہے۔ حالانکہ قرآن و حدیث کا ایک لفظ بھی نہیں پیش کیا جا سکتا جس سے ثابت ہو کہ اسلام ایسے حالات میں تحدیدِ ملکیّت کے اصول کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ اگر ہمارا موجودہ زمیندار اور جاگیردار طبقہ اپنی مملوکہ زمینوں کی صحیح طور پر دیکھ بھال کرتا اور زرعی پیداوار کی ترقی اور اضافہ کے لئے ایسی تدابیر اختیار کرتا جن سے اہلِ ملک کی غذائی اور زرعی ضروریات بہتر طریقہ سے

پوری ہوتیں تب تو ملکیت زمین کی تحدید کا اصول اختیار کرنے میں ایک اخلاقی اور معاشرتی نقصان کا اندیشہ تھا۔ لیکن یہ لوگ اضافہ پیداوار یا زمین کی قوت پیداوار کو بہتر کرنے کے بجائے اپنی غفلت اور تساہل سے اسے روز بروز ناکارہ اور غیر پیداآور بنا رہے ہیں اور اس طرح اس مقصد اور غرض کی نفی کر رہے ہیں جس کے لئے قدرت نے زمین میں نمو اور پیداوار کی قوت رکھی ہے۔ ایسی صورت میں زمین پر ان کے حقِ ملکیت کی تحدید نہ کرنا معاشرہ کے حق میں صریحاً ظلم ہے سوال یہ ہے کہ کیا اسلام اس ظلم کو جائز رکھتا ہے اور اسلامی اصولوں کے لحاظ سے کیا یہ بات پسندیدہ اور مستحسن ہے کہ اشیاء کو جن اغراض و مقاصد کے لئے قدرت نے پیدا کیا ہے اگر کوئی فرد یا جماعت انہیں نقصان پہنچائے جب بھی اس کے حقوقِ ملکیت کا احترام روا رکھا جائے اور معاشرہ کے اجتماعی حق کا کچھ خیال نہ کیا جائے۔ کیا حضرت عمرؓ کی خلافت میں ایسی مثالیں نہیں ملتی ہیں کہ آپ نے کسی شخص کو کسی مقصد کے لئے زمین عطا کی اور پھر اس بنا پر واپس لے لی کہ وہ اس مقصد کے حصول میں ناکام رہا۔ اگر اس عمل کو محض اس بناء پر خلافِ اسلام قرار دیا جائے کہ اسلام نے اپنے زمانہ میں تحدید ملکیت زمین کا یہ مخصوص طریقہ استعمال نہیں کیا تھا۔ تو اسی اُصول کی بنا پر آج کل کی مسلمان حکومتوں کے لئے یہ کیسے جائز ہوسکتا ہے کہ وہ زکوٰۃ۔ عُشر۔ خراج اور عشور کے علاوہ عوام الناس سے کوئی اور محصول وصول کریں جبکہ اسلام نے اپنے زمانہ میں ان چند محصولات کے علاوہ اور کوئی محصول مُسلم رعایا سے نہیں لیا تھا۔

بالفاظِ دیگر کیا اس زمانہ میں یہ ممکن ہے کہ کسی حکومت کا طریق محصول اندازی من وعن وہی ہو جو اسلامی عہد میں تھا۔ ہمارے خیال میں آج کل کے زمانہ میں اگر کوئی مُسلم یا غیر مُسلم حکومت صرف مذکورہ بالا چار محصولوں پر اکتفا کرے تو وہ ایک روز کے لئے بھی اپنے اخراجات پورے نہیں کرسکتی۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو نئے نئے محصولات عائد کئے گئے ہیں انھیں محض اس بنا پر غیر اسلامی یا مخالف اسلام نہیں قرار دیا جاسکتا ہے کہ عہدِ رسالت یا خلافت راشدہ کے دَور میں یہ محصول نہیں لئے گئے تھے۔ پھر زمینداروں اور جاگیرداروں کی ملکیت کو محدود کرنے اور زمین کی منصفانہ تقسیم کے لئے اگر اس زمانہ میں نئی تدابیر اختیار کی جائیں تو انھیں محض اس وجہ سے کیونکر منافی اسلام قرار دیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے اپنے دَور میں یہ تدابیر نہیں استعمال کی تھیں۔ جو لوگ زمینداریوں اور جاگیروں کو علی حالہ قائم رکھنا چاہتے ہیں ان کے استدلال کی بنا پر حضرت عمرؓ کا یہ فعل بھی خلاف اسلام تھا کہ انھوں نے اپنے زمانہ خلافت میں مسلمانوں کو حصول اراضی سے روک دیا۔ حالانکہ اس امتناع کے لئے سنّت نبوی سے انھیں کوئی سند نہیں مل سکتی تھی۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں حصول اراضی پر اس قسم کی کوئی پابندی نہیں عائد کی تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ کے اس فعل پر کسی صحابی نے اعتراض نہیں کیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام سنت کا وہ مفہوم نہیں لیتے تھے جو آج کل کے علماء لیتے ہیں۔ اور نہ وہ اس امر کو خلاف شرع یا منافی اسلام سمجھتے تھے کہ حالات

کی تبدیلی اور نئے تقاضوں کے مدِ نظر ان امور میں ترمیم و تجدید کی جائے جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی صریحی حکم نہیں دیا تھا۔

زمینداریوں اور جاگیروں کے بارے میں ہم نے جس نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے وہی نقطۂ نظر بٹائی پر بھی صادق آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بٹائی کا طریقہ رائج تھا لیکن ہم نے اوپر جس حدیث کا حوالہ دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ طریقہ ناپسند تھا۔ اور آپ مسلمانوں کو ہدایت فرماتے تھے کہ زائد زمین کو کرایہ پر دینے کی بجائے دوسرے مسلمان بھائیوں کو مفت دینا بہتر ہے۔ اگر عملی مجبوریاں راہ میں حائل نہ ہوتیں تو بہت ممکن ہے کہ آپ اس طریقہ کو حکماً بند کر دیتے۔ لیکن چونکہ اس زمانہ میں اس طریقہ کو مسدود کر دینے سے معاشی انتشار پیدا ہونے کا امکان تھا اس لئے آپ نے اس کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ حضرت امام ابو حنیفہ کی رائے بھی یہی تھی کہ بٹائی کا طریقہ ناجائز ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

لا یجوز المساقاۃ ولا المزارعۃ الا بالدارھم والدنانیر وما اشبھھما۔

باغبانی کا معاملہ اور کاشت کا معاملہ ہر دو صورت میں جواز کی شکل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ان کو درہم اور دینار وغیرہ کی شکل میں بندوبست کیا جائے۔

یہ بات کہ مسلمان حکومتوں نے حضرت امام ابو حنیفہ کے اس فیصلہ کو تسلیم نہیں کیا اور فتویٰ حضرت امام ابو یوسف اور امام محمد کے فیصلہ پر دیا جاتا رہا اس حقیقت کو بدل نہیں سکتی ہے کہ بٹائی کا طریقہ منشائے اسلام کے خلاف تھا اور صرف عملی مجبوریاں اس کی ممانعت میں حائل تھیں۔

اسلام کا معاشی نظریہ

مصنفہ محمد مظہر الدین صدیقی ایم۔اے

قیمت تین روپے

اسلام اور مسئلہ زمین

مصنفہ پروفیسر محمود احمد ایم۔اے

قیمت تین روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ ۲ کلب روڈ۔ لاہور